التفسیر: مجلس تفسیر، کراچی جلد ۱۰، مسلسل شمارہ ۱۹، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۹۸-۱۰۰

انتخاب

ترقیٔ علوم

سر سید احمد خانؒ

مسلمانوں میں ترقی علوم کی ایک عجیب سلسلہ سے ہوئی ہے۔ سب سے اول بنیاد ترقی علوم کی جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی کہ انہوں نے زید ابن ثابت کو متعین کیا کہ قرآن مجید کو اول سے آخر تک یک جا جمع کر کر بطور ایک کتاب کے لکھ دیں چنانچہ انہوں نے لکھا جیسا کہ اب موجود ہے۔

دوسری دفعہ مسلمانوں کے علم کو اس وقت ترقی ہوئی جب کہ لوگوں نے حدیث کو جمع کرنے کا ارادہ کیا اگرچہ اول اول لوگ اس کو برا جانتے تھے (اور شاید ان کی رائے صحیح ہو) مگر دوسری صدی میں سب نے اس کی ضرورت کو قبول کیا اور حدیثوں کو جمع کرنے اور حدیث کی کتابوں کے لکھنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ سب سے اول کس نے اس کام کو شروع کیا بعضے کہتے ہیں کہ سب سے اول امام عبد الملک بن عبد العزیز ابن جریج بصری نے جنہوں نے ۱۵۵ ہجری میں وفات پائی کتاب تصنیف کی۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ابو نصر سعید ابن عروبہ نے جنہوں نے ۱۵۶ ہجری میں انتقال کیا، کتاب تصنیف کی اور بعضے کہتے ہیں کہ ربیع ابن صبیح نے جو ۱۶۰ ہجری میں مر گئے سب سے اول کتاب لکھی اور اسی زمانہ کے قریب میں سفیان بن عیینہ اور مالک ابن

انس کی تصنیفات مدینہ میں، اور عبد اللہ ابن وہب کی تصنیفات مصر میں، اور معمر اور عبد الرزاق کی تصانیف یمن میں اور سفیان ثوری اور محمد ابن فضیل ابن غزوان کی کوفہ میں اور حماد ابن سلمہ اور روح ابن عبادہ کی بصرہ میں اور ہشیم واسط اور عبد اللہ ابن مبارک کی خراسان میں شائع ہوئیں۔

تیسری دفعہ مسلمانوں کے علم کی ترقی اس وقت ہوئی کہ بعض لوگوں نے عقاید مذہبی میں اختلاف کیا اور فرق بدع و اہواء کا شیوع ہوا اور علم کلام میں کتابیں تصنیف ہونی شروع ہوئیں پھر اسی علم کلام کو اور زیادہ ترقی ہوئی جبکہ تردید مسائل فلسفہ یونانیہ بھی جو عقاید اسلام کے برخلاف تھے اس میں شامل کیے گئے۔ سب سے اول اس علم میں حارث محاسبی نے کتاب تصنیف کی جو حضرت امام احمد حنبلؒ کا ہمعصر تھا۔ اول اول علماء اور اتقیاء اس علم کو زندقہ و الحاد سمجھتے تھے پھر رفتہ رفتہ اس کی ایسی ضرورت معلوم ہوئی کہ فرض کفایہ تک نوبت پہنچ گئی۔

چوتھی دفعہ مسلمانوں کے علم کی ترقی خلفاء عباسیہ کے عہد میں ہوئی کہ یونانیوں کے علوم یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئے اور مسلمانوں میں رائج ہوئے۔ اول اول ان علوم پڑھنے والوں پر بھی کفر و ارتداد کے فتوے ہوئے مگر چند روز بعد یہی علوم مدار فضیلت و کمال قرار پائے۔

پانچویں دفعہ مسلمانوں کے علم کی ترقی اس وقت ہوئی جب کہ مسلمان عالموں نے معقول و منقول کی تطبیق کو ایک امر لازمی اور ضروری سمجھا اور یقین کیا کہ بغیر اس کے انسان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

اس فن میں سب سے زیادہ کمال امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے حاصل کیا۔ ان کی کتاب احیاء العلوم گویا سرچشمہ اس فن کا ہے۔ اگرچہ ابتداء میں امام غزالیؒ کی نسبت بھی کفر کے فتوے ہوئے اور ان کی کتاب کے جلا دینے کے اشتہار کیے گئے مگر آخر کو حجۃ الاسلام ان کا لقب ہوا اور ان کی کتاب کو تمام عالم نے تسلیم کیا۔

اس کے بعد بہت کم کتابیں اس فن میں تصنیف ہوئیں مگر اخیر زمانہ میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرف متوجہ ہوئے اور کتاب حجۃ اللہ البالغہ لکھی جو بلحاظ اس

زمانہ کے در حقیقت نہایت عمدہ اور عجیب لطیف کتاب تھی۔

مگر اب یہ تمام وقت جن کی کہانی ہم نے بیان کی گذر گئے اور اب بڑی ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں دو طرح پر علوم کی ترقی ہو۔

اول۔ جس طرح کہ قدیم یونانی فلسفہ اور حکمت ہم مسلمانوں نے حاصل کی تھی اب فلسفہ و حکمت جدیدہ کے حاصل کرنے میں ترقی کریں کیونکہ علوم یونانیہ کی غلطی اب علانیہ ظاہر ہو گئی ہے اور علوم جدیدہ نہایت عمدہ اور مستحکم بنیاد پر قائم ہوئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جس طرح علماء سابق نے معقول یونانیہ اور منقول اسلامیہ کی مطابقت میں کوشش کی تھی اسی طرح حال کے معقول جدیدہ اور منقول اسلامیہ قدیمہ کی تطبیق میں کوشش کی جاوے تاکہ جو نتائج ہم کو پہلے حاصل ہوئے تھے وہ اب بھی حاصل ہوں۔

اس کام کے کرنے میں بلا شبہ بہت سے نادان برا کہیں گے اور زبان طعنہ دراز کریں گے مگر ہم کو اس پر کچھ خیال کرنا نہیں چاہیئے کیونکہ جن اگلے لوگوں نے ایسا کیا تھا ان کا بھی یہی حال ہوا تھا مگر آخر کو سب لوگ اس کی قدر کریں گے۔

(تہذیب الاخلاق بابت ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۸۸ ھ)

التفسیر: مجلس تفسیر، کراچی جلد ۵، مسلسل شمارہ ۱۰، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۱-۱۰۵

تبصرۂ کتب

شعوبیت۔ ایک مطالعہ
ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر
بار اول، جنوری ۲۰۱۱ء
قرطاس، کراچی
صفحات ۲۱۸، قیمت ۱۵۰
مبصر مفتی محمد اعظم سعیدی

محترمہ نگار سجاد ظہیر صاحبہ شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی سے وابستہ ہیں اور اپنے موضوع پر واقعی استادانہ دسترس کی مالک ہیں، قبل ازیں موصوفہ کی متعدد کتب سے استفادہ کا موقع ملا ہے اور انہی صفحات میں گلہائے تحسین بھی پیش کر چکا ہوں اس لیے کہ میری سوچ کے صحرا میں وہی خود رو پھول اگے ہوئے تھے جو نگار صاحبہ کی کتابوں میں اگے ہوئے تھے، مگر زیر نظر کتاب کے مندرجات کے حوالے سے میری سوچ کچھ مختلف ہے۔

محترمہ نگار صاحبہ نے عرب کے بادیہ نشینوں کی عرب سے نکل کر عجم پر ان کی حکمرانی و سطوت کو دینی محبت اور عربوں سے مذہبی عقیدت سے سرشار ہو کر ایرانی، ترکستانی اور رومی شعوبیت کو قلم کی نوک پر رکھا ہے، جب کہ راقم اپنے صحراؤں میں شعوبیت کے جلوے دیکھنے کا خوگر و عادی ہے، ۴۱ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا صحرائے تھر اور چولستان کے علاوہ صحرائے تھل اور دامان کے امن پسند اور تیر و تفنگ سے نا آشنا باسی ہزاروں سالوں پر محیط پے در پے قبضہ گیری کے خلاف، حملہ آوروں کے دین کی آڑ میں اہل تسویہ کا رول ادا کریں اور یہی اسطور اپنی عظمت رفتہ کے گیت گائیں تو میں ان کے اس عمل کو اور قبضہ گیروں کی ہجو و تنقیص کو زندیقیت کا نام نہیں دے سکتا۔

خلاصہ کتاب یہ ہے کہ مفتوح و مغلوب (ایرانی، ترکی، رومی) لوگوں کا عربوں کی مذمت کرنا اور ہر معاملہ میں ان کی تنقیص کرنے کا نام شعوبیت ہے اور پھر دینی حمیت، عربوں سے عقیدت کے ناطے شعوبیوں کے گلے میں زندیقیت کی مالا ڈال دی گئی ہے یعنی مفتوحوں کی ذلت کا آخری تمغہ۔۔۔

شعوبیوں کے دو گروہوں میں ایک کو اہل تسویہ کا نام دیا گیا ہے، یہ مغلوب و مفتوح قوم کے وہ لوگ تھے جنہوں نے عربوں کی سیادت، فضیلت و برتری کے رجحان کے مقابلے میں اپنی مغلوب و مفتوح قوم کی تذلیل و تحقیر کے مداوا کے لیے قلم کو ہتھیار بنایا اور عرب فاتحین کے دین کو ڈھال بنا کر انسانی مساوات کا علم بلند کیا اور عزت و تکریم کی بنیاد تقویٰ کو قرار دیا، اہل تسویہ مسلمان تھے مگر فاتحین کے نغمہ سراؤں کی طرف سے زندیق ٹھہرائے گئے۔ جب کہ دوسرا گروہ ''المتطرفون'' کہلایا جو عربوں کے رجحان حق حکمرانی اور وثیق شوکت و ثروت کے مقابلے میں اپنی قوم کو حملہ آوروں کے مقابلہ میں اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، معاشی اور صنعت و حرفت کے حوالے سے برتر قرار دیتا تھا، اور اپنی دینی، جسمانی، روحانی، ذہنی، شخصی، تہذیبی آزادی و مختاری پر قبضہ گیری کو ناپسند کرتا تھا، اپنی غلامانہ اور خواتین کی کنیزانہ زندگی انہیں قبول نہیں تھی، جس پر انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے قلم اٹھایا مگر زندیق ٹھہرائے گئے، بقول محترمہ نگار سجاد صاحبہ اہل اسلام میں ان کی کتب کو پذیرائی نہ ملی اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، خوش عقیدگی کے حوالے سے ان کی بات سو فیصد درست ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فاتحین، مغلوبوں کے علمی شاہکار اور تہذیبی آثار کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہلاکو نے بغداد میں کیا تھا، کیا اموی، علوی، فاطمی، عباسی ان کی کتابوں کو پذیرائی بخشتے؟

حملہ اور قبضہ گیر کے خلاف فطری ردعمل کا نام شعوبیت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ قبضہ گیری یا فتوحات کا پس منظر دینی ہو یا وسائل معاش پر قبضہ گیری ہو، ہر ایک پس منظر سے فاتح، مغلوبوں کی معیشت، خود مختیاری، حق خود اختیاری سلب کرتا ہے، مفتوحوں کی تذلیل و تحقیر اپنا حق اور جزو ایمان گھتا ہے، کسی ملک یا خطے پر شب خون مار کر اپنا قبضہ و تسلط قائم کر کے جملہ اموال و اسباب کا مالک بن جاتا ہے اور مغلوبوں کے ذرائع معاش میں جزیہ، اخراج کی شکل میں اپنا حصہ طلب کرتا، پھر اسے خدائی حکم قرار دیتا، یہ عمل جنگجو فاتح کے نزدیک تو ایمان کا جزو ہو سکتا لیکن مغلوب بطیب خاطر اپنے گلے اٹھنے کو قبول نہیں کرے گا، یہی وجہ ہے کہ قومیں اپنے افکار و آثار، مذہبی اقدار، تہذیبی شعائر، وسائل رزق اور سرزمین کے تحفظ کے لیے ہزاروں جانوں کی قربانی دیتی ہیں، اور مغلوب ہونے کی صورت میں غداری اور غلامی کا طوق ان کے گلے میں ڈالا جاتا ہے، ان کی مائیں، بہنیں، بیویاں، بہو بیٹیاں اپنے پیاروں کے قاتلوں کی لونڈیاں بن جاتی ہیں اور وہ لوگ بغیر ان کی رضامندی و نکاح کے ان کے جسموں کو نوچتے اور ادھیڑتے رہتے ہیں، یہ فاتحین، مغلوبوں کو تذلیل کی ایسی دلدل میں پھینکتے ہیں کہ وہ بے چارے زندگی کی بقا کے لیے اپنا دین و ایمان تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ جب